صفیہ آفتاب
اُستاد، شعبۂ اُردو
جامعہ کراچی

سیّد سلیمان ندوی کے اسلوبِ نثر کی انفرادیت

ABSTRACT

The Uniqueness of Syed Sulaiman Nadvi's prose style.
By Dr. Safia Aftab, Assistant Professor, Department of Urdu, University of Karachi.

Syed Sulaiman Nadvi is considered one of those writers of Urdu who have penned significant books on religious as well as literary and academic issues. His prose style is one of the characteristic for which he is famous. The prominent features of his prose style have been discussed and analyzed in this research article. The researcher has concluded that Syed Sulaiman Nadvi's style is simple but elegant. His flowing prose beautifully captures the era of the matters and it is at the same time intelligible and comprehensive.

سید سلیمان ندویؒ کا شمار بیسویں صدی کے ان نثر نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اہم علمی ، ادبی و مذہبی موضوعات پر تصانیف تحریر کیں۔ان تصانیف کی علمی و ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ایک اور خصوصیت ان کا اسلوب ہے۔سید صاحب کے مختصر تعارف کے بعد ان کی چند تصانیف میں سے اسلوب کے نمونے یہاں دیے گئے ہیں۔

سید صاحب کی پیدائش ضلع پٹنہ ریاست بہار کے ایک گاؤں دسنہ میں ۲۳،نومبر ۱۸۸۴ء بمطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں پھلواری شریف اور پھر دربھنگہ میں پائی(۱)۔۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور یہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔یہاں مولانا فاروق چڑیا کوٹی جیسے جید عالم نے سید صاحب کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔۱۹۰۵ء میں علّامہ شبلی نعمانی ندوہ کے باقاعدہ معتمد تعلیم ہوئے تو سید صاحب کو بہت خوشی ہوئی اور اس کا اظہار انھوں نے ایک طویل فارسی قصیدہ لکھ کر کیا(۲)۔علامہ شبلی نعمانی کی صحبت اور تربیت نے سید سلیمان ندویؒ جیسے گوہر کو وہ آب داری بخشی کہ ادب اس سے منوّر ہو گیا۔

سید صاحب کا ایک معروف علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق تھا۔نجیب الطرفین سید تھے۔روحانی لحاظ سے والد بھی درویش صفت بزرگ تھے(۳)۔اس تعلیم و تربیت کا سید صاحب کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔آپ کی تحریروں کے اکثر موضوعات مذہبی اور اسلامی نوعیت کے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پندرہ سولہ برس کی عمر میں کانوں میں دو آوازیں دم بدم آ رہی تھیں۔ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل و فطرت کی مطابقت کی کوشش اور دوسری علماء کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کر کے

پرانی عربی تعلیم کی ازسرنو کی تنظیم کی تحریک جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے تھے۔اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علیگڑھ کی ایک عربی درس گاہ تھی جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے۔کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں مگر میرا خاندانی ماحول اس دوسری تحریک سے متاثر تھا اس لیے اسی دوسری تحریک سے دل چسپی ہوئی اور وہ بڑھتی گئی اور پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جزو بن گئی (۴)۔''

سید صاحب محقق تھے اور محقق بھی ایسے کہ بعض دفعہ صرف ایک لفظ کی تحقیق کے لیے کئی کئی کتب خانے چھان لیتے،لوگوں سے تحقیق کرتے اور جب تک مطمئن نہ ہوجاتے کوئی رائے قائم نہ کرتے۔یہ تو صرف ایک لفظ کی تحقیق کا ذکر ہے جب ان کی دیگر کتب دیکھیں جن میں ارض القرآن،خطباتِ مدراس،سیرت النبی ﷺ،سیرتِ عائشہ،عربوں کی جہازرانی،خیّام وغیرہ شامل ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق میں اس قدر جاں فشانی اب ناممکن ہے۔یہ تحقیقی ذوق بھی شبلی نعمانیؒ کی تربیت کا فیض تھا۔سید صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے استاد تحقیق کے لیے طالب علموں سے سخت محنت اور احتیاط کرواتے تھے اور ساتھ ہی تاکید کرتے تھے کہ ''معنی کے ساتھ عبارت کی چستی،طرزِ ادا کی شگفتگی،تشبیہ واستعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے۔پامال معلومات،مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے (۵)۔'' انھوں نے اپنی تمام تحریروں میں اسی احتیاط سے کام لیا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کے نام ایک مکتوب میں انھیں ہدایت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اکثر تکثیرِ مواد کے لیے لوگ قیاسات کو دلائل کی جگہ دے دیتے ہیں،آپ اس سے احتراز فرمائیے۔جب تک کوئی بات محقق نہ ہوجائے، قبول نہ کیجیے (۶)۔''

سید صاحب کا ایک اہم کارنامہ دارالمصنفین کی تشکیل اور اسے ایک فعال ادارہ بنانا تھا۔جس کا منصوبہ شبلی نعمانیؒ نے بنایا تھا اور عملی جامہ ۱۹۱۵ء میں سید صاحب نے پہنایا۔۱۹۱۶ء میں ''معارف'' کے نام سے ماہنامہ جاری کیا،۳۵ سال تک اس کے مدیر رہے۔اگست ۱۹۳۸ء میں اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو آپ کو خلافت سے نوازا گیا۔۱۹۵۲ء میں جامعہ کراچی قائم ہوئی تو سید صاحب اس کی سینیٹ کے ممبر منتخب ہوئے (۷)۔اس تمام عرصے میں تصنیف وتالیف کا عمل برابر جاری رہا اور ندوہ سے جس علمی اور ادبی سفر کا آغاز ہوا تھا اس کا اختتام ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ان کی وفات کی صورت میں ہوا۔

سید صاحب کثیر التصانیف تھے۔انھوں نے مختلف موضوعات پر بہت لکھا۔ان کی خصوصیت یہ ہے کہ

موضوعات کے مطابق اسلوبِ بیان پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ کہیں طرزِ تحریر نہایت سادہ ہوتی ہے کہیں سحر انگیز۔ کہیں جوش و جذبات کا تاثر ہے، کہیں احترام و محبت کی فراوانی۔ جہاں صورتِ حال غمگین ہو تو بیان کا انداز ہی الگ ہو جاتا ہے لیکن ہر جگہ عالمانہ اور ادبی شان برقرار رہتی ہے۔ اسلوب کی یہ رنگا رنگی بہت کم مصنّفین میں نظر آتی ہے۔ سید صاحب کے اسلوب کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کہتے ہیں:

> ''سیرت النبی ﷺ کی ضخیم مجلّدات سے لے کر خیّام، خطباتِ مدراس اور رحمتِ عالم ﷺ تک کون سی ایسی کتاب ہے جہاں حضرت سلیمان ایک خشک مولوی، ملّا معلوم ہوتے ہوں اور صحتِ زبان و سلاستِ بیان نمایاں نہ ہو۔ شستگی، متانت، شرافت یہ تو ان کے اسلوبِ تحریر کے جوہرِ اصلی ہیں اور اس سے جا بجا شوخی و ظرافت کی گل کاریاں اور حسنِ صناعت کی سحر طرازیاں، جیسے خاتمِ سلیماں میں نگین (۸)۔''

اسلوب کیا ہے؟ سید عابد علی عابد نے اسلوب کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے جو مثالیں دی ہیں ان کے مطابق:

> ''اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے، جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیّز ہو جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں (۹) جب یہ انفرادیت۔۔۔ تکمیلِ فن کے مراحل طے کرتی ہے تو خوبی کہلاتی ہے (۱۰)۔''

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ اسلوب جو مطلوبِ فن ہے اور مقصودِ ادب ہے، انفرادیت سے ماورا ہوتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا ظہور ہمیشہ منفرد طریقے پر ہوتا ہے... اسی اسلوب میں فن کار اپنی ذاتی واردات اور تجربات کو آفاقی تجربات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے، غمِ ذات کو غمِ جہاں بنا دیتا ہے، غمِ یار، غمِ روزگار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ اسلوب ادبی تخلیق کا نقطۂ عروج ہے اور اس کے بغیر کلاسیکی عظمت بھی حاصل نہیں ہو سکتی (۱۱)۔''

عابد علی عابد اسلوب کی مثال کے لیے نظیر اکبر آبادی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نہ وہ صرف و نحو کی پروا کرتا ہے، نہ تلفظ کی، نہ املا کی اور نہ معانی و بیان کے پھیر میں

پڑتا ہے۔لیکن جب شعر کہتا ہے تو وہ انفرادیت جو مقصودِ فن ہے، صاف ظاہر ہوتی ہے اور ہم نہ صرف بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظیر اکبرآبادی کا کلام ہے بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلوب اسی سے مخصوص ہے اور کوئی دوسرا شاعر اس طریقِ اظہار پر قادر نہیں (۱۲)۔''

اسلوب کی اس مختصر تعریف کے بعد سید سلیمان ندویؒ کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ سید صاحب کی تمام تصانیف اپنے اسلوب کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ان سب میں سے اقتباسات کے نمونے طوالت کے خوف سے نہیں لیے جاسکتے۔اس لیے چند مشہور تصانیف کے نمونے لیے گئے ہیں۔جن سے طرزِ تحریر کی انفرادیت وخصوصیات بخوبی نظر آتی ہیں۔

سیرت النبی ﷺ، جس کی ابتدا شبلی نعمانی نے کی تھی اسے، استاد کی خواہش کے مطابق تکمیل تک پہنچانا سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔سیرت النبی ﷺ میں اندازِ بیان عالمانہ اور لب ولہجہ سنجیدہ اور پُر وقار ہے۔یہاں احترام اور احتیاط غالب ہے۔سید صاحب اپنے استاد کے احسان مند تھے کہ انھوں نے اس موضوع کی تکمیل کے لیے سید صاحب کا انتخاب کیا تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکلِ وصیت سرورِ کائنات ،فخرِ موجودات، رحمتِ عالم، سید اولادِ آدم محمد رسول اللہ ﷺ کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اوّل پہنچایا (۱۳)۔''

سیرت النبی ﷺ کے موضوعات کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اس سلسلے کا تعلق صرف مغازی اور سیر کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے۔صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلے کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا۔سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں (۱۴)۔''

سیرت النبی ﷺ میں نبی اور غیر نبی کے امتیازات کے بارے میں پُر جوش ہو کر کہتے ہیں:

''دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زورِ بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں، انھوں نے کبھی کبھی چار دانگِ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان ومال پر اپنا اقتدار جمایا... بازاروں اور راستوں میں امن وامان پیدا کر

دیا،لیکن کیا انھوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے؟اپنی سلطنت کے دائرے سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنا حکم منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟... ہر شیریں نوا واعظ، ہر موثر بیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت ورسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں۔ جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں(۱۵)۔''

سادہ الفاظ میں عملِ صالح کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایمان بنیادی اصولوں پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے اور عملِ صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم ویقین کامیابی کے لیے کافی نہیں جب تک اس علم ویقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو(۱۶)۔''

نماز کا ذکر کرتے ہیں تو تحریر سے جوش اور دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے:

''نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان ورحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد وثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم وجان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق ومخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حسّاس واثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے(۱۷)... رب کی بڑائی بولنا، یہی نماز کی بنیاد ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے(۱۸)۔''

جھوٹ کے لیے کہتے ہیں:

''اللہ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ دنیا کے ذرّے ذرّے کو گھیرے ہوئے

ہے۔اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے،مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سائے سے وہ باہر ہے جس کا منھ جھوٹ کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے(۱۹)۔''

سیرت النبی ﷺ کی تمام جلدوں میں زبان و بیان کا یہی انداز ہے۔مختلف مصنفین نے سیرت النبی ﷺ کو سید صاحب کا عظیم کارنامہ قرار دیا ہے۔

سیرتِ عائشہؓ کے لیے سید صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ان کی ابتدائی تصنیف ہے جس کا آغاز طالب علمی میں کیا گیا تھا مگر اس کی تکمیل ان کے استاد کی وفات کے بعد ہوئی اور اشاعت ۱۹۲۰ء میں اس وقت ہوئی جب وہ وفدِ خلافت کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے(۲۰)۔

سیرتِ عائشہؓ کا اسلوب نہایت سادہ اور رواں ہے۔سید صاحب نے اہم تاریخی واقعات کو تحقیقی حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔موضوع کیوں کہ احترام کا متقاضی تھا اس لیے احتیاط کے ساتھ پُر تاثر اسلوب نمایاں ہے۔سیرتِ عائشہؓ کی وجہ تصنیف کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ وہم پرستی اور جاہلانہ مراسم ہمارے گھروں میں اس لیے زندہ ہیں کہ مسلمان خواتین کے قلوب میں تعلیماتِ اسلامی کی روح مردہ ہوگئی۔شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے سامنے 'مسلمان عورت' کی زندگی کا کوئی مکمل نمونہ نہیں۔آج ہم ان کے سامنے اس خاتون کا نمونہ پیش کرتے ہیں، جو نبوتِ عظمیٰ کی نو سالہ مشارکتِ زندگی کی بنا پر خواتین خیر القرون کے حرم میں کم و بیش ۴۰ برس تک شمع ہدایت رہی... یہ 'دنیا کے بزرگ ترین انسان' کی زندگی کا وہ نصف حصّہ ہے جو 'مراۃِ کاملہ' (کامل عورت) کا بہترین مرقع ہمارے سامنے پیش کرتا ہے(۲۱)۔

اب سیرتِ عائشہؓ میں سے چند دل نشین اقتباسات دیکھیے۔سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''سیدنا صدیقِ اکبرؓ کا کاشانہ وہ برجِ سعادت تھا جہاں خورشیدِ اسلام کی شعاعیں سب سے پہلے پرتو افگن ہوئیں۔اس بنا پر سیدہ عائشہؓ اسلام کے ان بر گزیدہ لوگوں میں سے ہیں جن کے کانوں نے کبھی کفر و شرک کی آواز نہیں سنی(۲۲)۔''

''رسول اللہ ﷺ کی کثرتِ ازواج اور خصوصاً سیدہ عائشہؓ کی اس کم سنی کی شادی میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ اگر چہ رسول اللہ ﷺ کے دائمی فیضانِ صحبت نے سیکڑوں مردوں کو سعادت کے درجۂ عالیہ پر پہنچا دیا تھا،لیکن فطرتاً یہ موقع عام عورتوں کو میسر نہیں آ سکتا تھا۔صرف ازواجِ مطہرات اس فیض سے متمتع ہو سکتی تھیں اور پھر یہ نور آہستہ آہستہ انھی ستاروں کے ذریعے سے پوری کائناتِ نسوانی میں پھیل

سکتا تھا(۲۳)۔''

ایک اور اقتباس دیکھیے:

''اللہ نے ان کو کاشانۂ نبوت کی ملکہ بنایا تھا۔اس فرض کو وہ نہایت خوبی سے انجام دیتی تھیں(۲۴)۔''

حضرت عائشہؓ کے مرتبے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس قدر شناسی کے لحاظ سے، جو آپ ﷺ سیدہ عائشہؓ کی بابت فرماتے تھے،اس صحبت وتعلیم کی بنا پر جو ان کو میسر آئی تھی،اور اس فطری جوہر اور صلاحیت کے لحاظ سے جو قدرتِ کاملہ نے ان کو عطا کی تھی،اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اہلِ بیتِ نبوی ﷺ میں سیدہ عائشہؓ کو خاص مرتبہ حاصل تھا(۲۵)۔''

''خطباتِ مدراس'' سید صاحب کی مشہور ومعروف کتاب ہے۔یہ سیرت النبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے ہیں جو سید صاحب نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے لالی ہال(مدراس) میں ہفتہ وار دیے تھے۔خطباتِ مدراس کا اسلوب بہت پُر جوش ہے۔ سید صاحب نے دلائل سے وضاحت کی ہے کہ عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے۔تحریر میں بہترین الفاظ کا انتخاب سید صاحب کی خوبی ہے۔خطبات میں سے چند اقتباسات دیکھیے:

''ایک لمحے کے لیے نشۂ دینی سے سرمست ہوکر اپنی جان دینا آسان ہے مگر پوری عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں، ہر کیفیت میں آپ کی اتباع کے پلِ صراط کو اس طرح طے کرنا کہ کسی بات میں سنتِ محمدی ﷺ سے قدم اِدھر اُدھر نہ ہو، سب سے مشکل امتحان ہے(۲۶)۔''

یہ جوشِ خطابت تمام خطبات میں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی جامعیت کے باب میں کہتے ہیں:

''اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو،اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو،...اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درس گاہ کے معلم قدس کو دیکھو،اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ،...اگر یتیم ہو تو عبداللہؓ اور آمنہؓ کے جگر گوشے کو نہ بھولو،اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو،اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ وحسینؓ

کے نانا کا حال پوچھو(۲۷)۔''

''دنیا میں جس چیز نے سب سے زیادہ گمراہی پھیلائی وہ دین اور دنیا کا فرق ہے... یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو دنیا میں پھیلی تھی۔ اس غلطی کا پردہ پیغامِ محمدی ﷺ کی نور افگن شعاعوں نے چاک کر دیا اس نے بتایا کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اسی دنیا کے کاموں کو خدا کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق انجام دینا دین ہے، یعنی خدا کے اصول کے مطابق دنیاداری ہی دین داری ہے(۲۸)۔''

اسلام کی تعریف کرتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں:

''اسلام جدوجہد، سعی وعمل اور سرگرمی ہے۔ وہ موت نہیں حیات ہے... ایمان اور اس کے مطابق عملِ صالح یہی اسلام ہے۔ اسلام عمل ہے، ترکِ عمل نہیں۔ ادائے واجبات ہے، عدمِ واجبات نہیں۔ ادائے فرض ہے، ترکِ فرض نہیں(۲۹)۔''

تحریر کا یہ انداز بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یہاں جوش وجذبے کے ساتھ کہتے ہیں کہ:

''میرا دل چاہتا تھا کہ تمھارے سامنے پیغامِ محمدی ﷺ کے احسانات کو ایک ایک کر کے گنا دوں، مگر افسوس کہ بقدرِ حوصلہ فرصت نہیں اور اس بحرِ ناپیدکنار کی تھاہ بھی نہیں(۳۰)۔''

''خطباتِ مدراس'' میں تحریر کا یہ انداز شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔

''نقوشِ سلیمانی'' سید صاحب کے خطبات اور مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں مقدمات بھی شامل تھے، بعد میں مقدمات الگ کر دیے گئے۔ سید صاحب کی مطابق زبان وادبِ اُردو کے متعلق ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۹ء تک جو تحریریں یا تقریریں تھیں، ان کا مجموعہ شائع کیا گیا تھا(۳۱)۔ اُردو ادب میں اس کتاب کی جو اہمیت ہے اس سے سب واقف ہیں۔ میں نے صرف ایک مضمون ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق' میں سے چند اقتباسات لیے ہیں۔ یہاں سید صاحب کا اسلوب نہایت شگفتہ ہے۔ تسلسل اور روانی جو 'اسلوبِ سلیمانی' کی خصوصیات ہیں، اس کی بہترین مثالیں اس مضمون سے لی جاسکتی ہیں۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ہماری ہندوستانی اُردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو پھر بھی اس کی ملکیت میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں، جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو سنانے کے لیے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں جن کو کاغذی تاریخ کے

اوراق بھلا چکے ہیں (۳۲)۔''

اب اندازِ تحریر دیکھیے:

''ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھیے تو کیسے کیسے لفظ بنتے اور معنی بدلتے ہیں۔ ذرا اسی ذرا پر غور کیجیے۔ کیا یہ عربی کا ذرّہ نہیں جس کو آپ 'ذرّۂ بے مقدار' کی صورت میں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا کے بہت ہی تھوڑے کے معنی ہو گئے۔ اور ایسے ہو گئے کہ اب اس کو ذرّہ سے ذرا بھی تعلق نہ رہا (۳۳)۔''

لفظ احدی کی تشریح دیکھیے:

''احدی کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں۔ مگر ان سست کاہلوں کی پیداوار تاریخی ہے... اَحَد کے معنی عربی میں ایک کے ہیں، وہ سپاہی جو فوج سے اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا۔ اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا۔ یہ احدی کھاتے تھے اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے۔ کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا اس لیے زبانِ خلق نے ان کو سست و کاہل کے معنوں میں کہہ کر پکارا۔ زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے۔''

ایک اور لفظ کی تشریح دیکھیے:

''ہماری زبان میں ایک لفظ قلعی ہے، آیئے، اس کی بھی قلعی کھولیں ہم لکھتے گو قلعی ہیں مگر بولتے قلی ہیں۔ ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں۔ برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے اور مکانوں پر پھیری جاتی ہے۔ ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے تو وہ اس پر قلعی کرنا ہوا اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کر کے دیکھا جائے تو وہ قلعی کھولنا ہوا (۳۴)۔''

اب لفظ تماشا کے معنی دیکھیے:

''تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے۔ لفظ تو عربی ہے لیکن معنی عجمی ہیں۔ یہ مستی سے بنا ہے جس کے معنی چلنے کے ہیں۔ اس کو بابِ تفاعل میں لے گئے تو تماشی ہوا معنی باہم مل کر چلنا ہوئے۔ عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدے سے تماشا بنا لیا (۳۵)۔''

ایک اور مثال دیکھیے:

''عربی کا صحیح لفظ تمنّی ہے مگر فارس والوں نے اس کو لیا تو تمنّا کر دیا اور ہم نے بھی اسی کو قبول کیا۔ عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا۔ لالٹین کی اصل لنٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے(۳۶)۔''

طرزِ تحریر کا یہ انداز سید صاحب کو منفرد بناتا ہے۔

''رحمتِ عالم''، مختصر سیرتِ رسول ﷺ ہے جو ۱۹۴۰ء میں چھپی۔ اس کا اسلوب سیدھا سادا اور عام فہم ہے۔ سید صاحب کے مطابق ان کے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے سیرت کی ایک مختصر کتاب لکھی جائے جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لیے آسان ہو اور پھر اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے۔ اس کتاب میں سید صاحب نے عبارت کی سادگی، طرزِ ادا کی سہولت اور واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کتاب کو اپنے آسان اسلوب کی وجہ سے پذیرائی حاصل ہوئی۔ پانچ ہزار کتب فوراً فروخت ہوگئیں۔ ہندی، گجراتی اور بنگالی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ دکن، پنجاب، یوپی اور بہار کے مختلف اسلامی مدرسوں اور مکتبوں میں داخلِ نصاب ہوئی(۳۷)۔

اب اسلوب کی سادگی اور اس سادگی کی دل نشینی دیکھیے:

''محمد ﷺ دنیا میں اس لیے پیدا کیے گئے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیام سنائیں، ان کو برائی اور بدی کی باتو ں سے بچائیں، اچھی اور نیک باتیں بتائیں(۳۸)۔''

سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''خدا کے دربار میں دولت اور ریاست کی نہیں بلکہ نیکی اور اچھائی کی قدر ہے۔ اس نے دنیا بنانے سے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ قریش کے گھرانے میں عبداللہؓ کے یتیم بیٹے محمد ﷺ کو اپنا آخری رسول بنا کر بھیجے گا(۳۹)۔''

نبی کریم ﷺ کے لیے کہتے ہیں کہ:

''یہ کیا عجیب بات ہے کہ ایک فوج کا جرنیل جس نے مسلسل نو برس لڑائیوں میں گزارے اور جس نے کبھی لڑائی کے میدان سے منھ نہیں موڑا، اس نے اپنے دشمن پر بھی کبھی تلوار نہیں اٹھائی اور نہ اپنے ہاتھ سے کسی پر وار کیا(۴۰)۔''

یہ کتاب اپنے عام فہم اسلوب کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ پوری کتاب میں طرزِ تحریر کا یہی انداز ہے۔

''حیاتِ شبلی'' سید صاحب کی وہ تصنیف ہے جس کا شمار سوانح نگاری میں ہوتا ہے۔ایک قابل ترین استاد کی سوانح ان کے قابل ترین شاگرد نے لکھی۔شبلی نعمانیؒ کی سوانح لکھنے کی تحریک کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا کی ترتیبِ سوانح کے سب سے بڑے خواہش مند منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے سید صاحب سے سفارش بھی کروائی تھی مگر شبلی نعمانی نے سید صاحب کو جواب لکھا کہ 'افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا (۴۱)۔''

سید صاحب نے مسلسل آٹھ برس (۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک) اپنے استاد کی صحبت و تربیت میں گذارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں اور رہا مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی (۴۲) اس لیے ان کی زندگی کے اکثر لمحات سے وہ واقف رہے، اس واقفیت نے سوانح لکھنے میں بہت مدد کی۔حیاتِ شبلی میں عالمانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ استاد سے محبت اور احترام کے جذبات کا اظہار بھی نظر آتا ہے۔حالات اور واقعات کے بیان میں سید صاحب نے بکثرت حوالے بھی دیے ہیں۔واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں، اس لیے اسلوب میں تسلسل اور تنوع بھی نظر آتا ہے۔

حیاتِ شبلی کی چند مثالیں دیکھیے۔سید صاحب لکھتے ہیں:

> '' پیشِ نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں جس نے بتیس برس (۱۸۸۲ء۔۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پُر شور رکھا (۴۳)۔''

شبلی نعمانی کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا نے کالج میں آکر جو قصائد لکھے اور خصوصیت کے ساتھ سفرِ روم میں جو نظمیں لکھیں اس نے فارسی کے اہلِ ذوق میں آگ سی لگا دی۔اُردو میں نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولانا حالیؔ نے ڈالی ہو یا شمس العلماء آزادؔ نے، مگر فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی اور اس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشے کی جگہ، جیسا کہ اب تک وہ تھی، مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے آبِ حیات بن گئی (۴۴)۔''

ایک اقتباس اور دیکھیے:

''مصنف کا قلم لگا تار تین چار برس فلسفہ وکلام کی پیچ در پیچ کوچہ گردیوں سے گھبرا کر خالص ادبیات کے سرسبز وشاداب میدان کا طالب ہوا(۴۵)۔''

ایک اقتباس میں طرزِ تحریر کا انداز دیکھیے:

''مولانا میر انیس کے مدّاح اور ان کے محاسنِ کلام کے دلدادہ تھے اور یوں بھی اقلیمِ سخن کے ان دونوں تاجداروں (انیسؔ و دبیرؔ) کے مقبوضات اور مفتوحات کی وسعت اور ہمہ گیری کی داستان سے ملک کی ساری ادبی محفلوں میں ہنگامہ برپا تھا(۴۶)۔''

سادہ اسلوب کی مثال دیکھیے:

''مولانا کی کثرتِ تصانیف کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے اوقات کا اکثر حصّہ تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صبح کو صرف ایک دو گھنٹے تصنیف وتالیف میں صرف کرتے تھے، اور صرف صفحہ دو صفحہ لکھتے تھے، بقیہ اوقات کتب بینی کے نذر ہوتے تھے(۴۷)۔''

حیاتِ شبلی میں سید صاحب نے استاد کی علمی، ادبی، سیاسی زندگی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی تمام خوبیاں اس سوانح میں نظر آتی ہیں۔

''یادِ رفتگان'' ان مضامین کا مجموعہ ہے جو سید صاحب نے ''معارف'' میں ۱۹۱۴ء سے لے کر اپنی وفات سے کچھ پہلے یعنی ۱۹۵۳ء تک لکھے۔ ان مضامین کے بارے میں رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم شناسا شخصیات کی وفات کا تذکرہ تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے ... سید صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت تھی اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے۔ کس حسنِ ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کے زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر جگمگاتے نظر آتے ہیں(۴۸)۔''

''یادِ رفتگان'' میں اسلوب کہیں سادہ ہے اور کہیں دلی جذبات وکیفیات کا اظہار نظر آتا ہے۔ سید ابو عاصم لکھتے ہیں:

''یہ کتاب حقیقت میں تقریباً نصف صدی کی داستانِ غم ہے، یہ صرف ان مضامین کا

مجموعہ نہیں ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی نے جانے والوں کے غم میں سپردِ قلم کیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کے دل کے ٹکڑے ہیں جو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، یہ چالیس سال کے آنسو ہیں (۴۹)۔''

دیکھیے مولانا محمد علی کے انتقال پر غم کا اظہار کس طرح کرتے ہیں:

''افسوس وہ پُردرد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحے میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو ہو جاتا تھا... قیامت تک کے لیے ساکن ہوگیا، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے ... افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چُور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو گا، الوداع !محمد علی الوداع!(۵۰)۔''

علّامہ اقبالؒ سید سلیمان سے دلی وابستگی رکھتے تھے۔ اکثر دینی مسائل کے لیے سید صاحب سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال کے انتقال پر سید صاحب کی تحریر کا انداز دیکھیے:

''شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستاں اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر... ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول ﷺ شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں شاید صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا... اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پروازِ بالِ جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر ان شاء اللہ باقی رہے گا (۵۱)۔''

مزید لکھتے ہیں:

''اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں۔ بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ قدرت کا محرم اور رموزِ فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفے کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے

رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا(۵۲)۔''

یہ اسلوبِ بیان نثر کی دل کشی میں اضافہ کرتا ہے۔

مولانا سجاد کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی تواضع میں بلندی سادگی، میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی۔ وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ 'راہ' اور 'منزل' کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا(۵۳)۔''

نواب فصاحت جنگ جلیل مانکپوری کو سید صاحب 'درویش شاعر' لکھتے ہیں۔ طرزِ تحریر کا ایک اور انداز دیکھیے:

''آج شاعر بہت ہیں مگر استاد کم ہیں جو فن کے مسائل پر کامل عبور رکھتے ہوں، جو تمام اصنافِ سخن پر برابر کی قدرت رکھتے ہوں، جو لفظوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں بلکہ لفظ ان کے ہاتھ میں ہوں، جن کے کلام سے زبان کے الفاظ، محاورات اور امثال کی تصدیق ہو، جن کا دیوان زبان کے سکّوں کی ٹکسال ہو، حضرت جلیلؔ اس دور کے، جو میرؔ و مرزاؔ سے شروع ہوا تھا، بظاہر خاتم معلوم ہوتے ہیں(۵۴)۔''

سید صاحب کے بھی 'ہاتھوں میں لفظ' تھے۔ اسلوب کا مختلف اور دل کو چھو لینے والا انداز ان کی تمام تصانیف میں ہے۔ علامہ اقبال ایک مکتوب میں سید صاحب کے لیے لکھتے ہیں:

''آج سید سلیمان ندویؒ ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں بلکہ امیر العلماء ہیں۔ مصنف ہی نہیں بلکہ رئیس المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں(۵۵)۔''

حواشی:

(۱) صباح الدین عبدالرحمٰن، سیّد، نقوش شخصیات نمبر ۴۷، ۴۸ (لاہور: ادارہ فروغِ اُردو، طبع اوّل، ۱۹۵۵ء)، ص ۱۸۰۔

(۲) ایضاً، ص ۱۸۱۔

(۳) عبدالحنان، قاضی، سیّد، علامہ سید سلیمان ندوی کی شانِ جامعیت (کراچی: الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، بار اوّل،

جون، ۱۹۹۰ء)ص ۲۷۔

(۴) سلیمان ندوی، سیّد، نقوش، آپ بیتی نمبر، اوّل (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو، جون ۱۹۶۴ء)، ص ۲۷۷۔

(۵) ایضاً، ص ۲۸۰۔

(۶) غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر، طوبیٰ لھم (حیدرآباد: رائل بک ڈپو، بارِدوم، ۱۹۹۵ء)، ص ۴۵۔

(۷) عبدالقوی دسنوی، پروفیسر (مرتّب)، یادگارِ سلیمان (پٹنہ: بہار اُردو اکیڈمی، دسمبر ۱۹۸۴ء)، ص ۱۰۷۔۱۰۸، ۱۱۵۔

(۸) صباح الدین عبدالرحمٰن، نقوش، محوّلہ بالا، ص ۱۸۸۔

(۹) عابد علی عابد، سیّد، اسلوب (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۴۲۔

(۱۰) ایضاً، ص ۴۸۔

(۱۱) ایضاً، ص ۵۰۔

(۱۲) ایضاً، ص ۵۰۔

(۱۳) سلیمان ندوی، سیّد، حیاتِ شبلی (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۲ فروری ۱۹۴۳ء) ص ۱۱۔

(۱۴) _____، سیرت النبی ﷺ (جلد پنجم)، دیباچہ (کراچی: دارالاشاعت، طبع اوّل مئی ۱۹۸۵ء) ص ۸۔

(۱۵) _____، سیرت النبی ﷺ (جلد چہارم)، (کراچی: دارالاشاعت، طبع اوّل، مئی ۱۹۸۵ء) ص ۳۴۔

(۱۶) _____، سیرت النبی ﷺ (جلد پنجم)، (کراچی: دارالاشاعت، طبع اوّل، مئی ۱۹۸۵ء) ص ۱۱۔

(۱۷) ایضاً، ص ۳۷۔

(۱۸) ایضاً، ص ۴۲۔

(۱۹) ایضاً، ص ۲۸۷۔

(۲۰) سلیمان ندوی، سیّد، سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا، دیباچہ (کراچی: دارالاندلس) ص ۱۵۔

(۲۱) _____، سیرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا، محوّلہ بالا، ص ۱۷۔۱۸

(۲۲) ایضاً، ص ۲۲۔

(۲۳) ایضاً، ص ۳۲۔

(۲۴) ایضاً، ص ۱۴۶۔

(۲۵) ایضاً، ص ۱۵۷۔

(۲۶) سلیمان ندوی، سیّد، خطباتِ مدراس (لاہور: ناشران قرآن لمیٹڈ، اُردو بازار، طبع سوم ۱۹۵۶)، ص ۹۷۔

(۲۷) ایضاً، ص ۱۰۵۔

(۲۸) ایضاً، ص ۲۰۴۔

(۲۹) ایضاً، ص ۲۰۶۔

(۳۰) ایضاً، ص ۲۰۴۔

(۳۱) سلیمان ندوی، سیّد، نقوشِ سلیمانی، مقدمہ طبعِ ثانی (کراچی: کلیم پریس، ۱۹۵۱ء) ص ب۔

(۳۲) _____، نقوشِ سلیمانی (کراچی: کلیم پریس، ۱۹۵۱ء) ص ۲۹۳۔

(۳۳) ایضاً، ص ۳۲۴۔

(۳۴) ایضاً، ص ۳۲۷۔

(۳۵) ایضاً، ص ۳۲۸۔

(۳۶) ایضاً،ص ۳۳۰۔
(۳۷) سلیمان ندوی، سیّد، رحمتِ عالم ﷺ، دیباچہ طبع اوّل وثانی (کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۳)
(۳۸) ایضاً،ص ۲۲۔
(۳۹) ایضاً،ص ۳۱۔
(۴۰) ایضاً،ص ۱۵۶۔
(۴۱) سلیمان ندوی، سیّد، حیاتِ شبلی (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، فروری، ۱۹۴۳) ص ۴۔۵
(۴۲) ایضاً،ص ا۔
(۴۳) ایضاً۔
(۴۴) ایضاً،ص، ۲۲۳۔
(۴۵) ایضاً،ص ۳۷۸۔
(۴۶) ایضاً،ص ۳۸۰۔
(۴۷) ایضاً،ص ۷۸۵۔
(۴۸) رشید احمد صدیقی، ہم نفسانِ رفتہ (لاہور: آئینہ ادب، چوک مینار، طبع اوّل، ۱۹۶۵ء) ص ۴۹۔
(۴۹) سلیمان ندوی، سیّد، یادِ رفتگان، مقدمہ (کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۹۸۳ء)، ص ۳۔
(۵۰) ایضاً،ص ۱۳۳۔۱۳۴
(۵۱) ایضاً،ص ۱۸۱۔
(۵۲) ایضاً،ص ۱۸۲۔۱۸۳
(۵۳) ایضاً،ص ۲۱۴۔
(۵۴) ایضاً،ص ۳۳۷۔
(۵۵) صباح الدین عبدالرحمٰن، نقوش، محوّلہ بالا، ص ۱۸۵۔

مآخذ:

۱۔ صدیقی، رشید احمد، ہم نفسانِ رفتہ، لاہور: آئینہ ادب، چوک مینار، طبع اوّل، ۱۹۶۵ء۔
۲۔ عابد، سیّد عابد علی، اسلوب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔
۳۔ عبدالحنان، قاضی، سیّد، علامہ سید سلیمان ندوی کی شانِ جامعیت، کراچی: الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، بار اوّل، جون، ۱۹۹۰ء۔
۴۔ عبدالرحمٰن، سیّد صباح الدین، نقوش، شخصیات نمبر ۴۷۔۴۸، لاہور: ادارہ فروغِ اُردو، طبع اوّل، ۱۹۵۵ء۔
۵۔ عبدالقوی دسنوی، پروفیسر (مرتّب)، یادگارِ سلیمان، پٹنہ: بہار اُردو اکیڈمی، دسمبر ۱۹۸۴ء۔
۶۔ غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر، طوبیٰ لھم، حیدرآباد: رائل بک ڈپو، بارِ دوم، ۱۹۹۵ء۔
۷۔ ندوی، سلیمان، سیّد، رحمتِ عالم ﷺ، دیباچہ طبع اوّل وثانی، کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۳ء۔
۸۔ _____، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، فروری، ۱۹۴۳ء۔
۹۔ _____، نقوشِ سلیمانی، کراچی: کلیم پریس، ۱۹۵۱ء۔
۱۰۔ _____، نقوشِ سلیمانی، مقدمہ طبعِ ثانی، کراچی: کلیم پریس، ۱۹۵۱ء۔

۱۱۔ _____، یادِ رفتگان، مقدمہ، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۹۸۳ء۔
۱۲۔ _____، نقوش، آپ بیتی نمبر، اوّل، لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو، جون ۱۹۶۴ء۔
۱۳۔ _____، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۲ فروری ۱۹۴۳ء۔
۱۴۔ _____، سیرت النبی ﷺ (جلد پنجم)، دیباچہ، کراچی: دارالاشاعت، طبع اوّل مئی ۱۹۸۵ء۔
۱۵۔ _____، سیرت النبی ﷺ (جلد چہارم)، کراچی: دارالاشاعت، طبع اوّل، مئی ۱۹۸۵ء۔
۱۶۔ _____، خطباتِ مدراس، لاہور: ناشران قرآن لمٹیڈ، اُردو بازار، طبع سوم ۱۹۵۶ء۔
۱۷۔ _____، سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا، دیباچہ، کراچی: دارالاندلس۔
۱۸۔ _____، سیرت النبی ﷺ (جلد پنجم)، کراچی: دارالاشاعت، طبع اوّل، مئی ۱۹۸۵ء۔